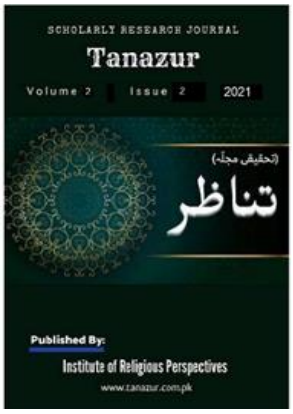

Tanāẓur

Volume: 2, Issue: 2, July-December: 2021

Homepage: http://tanazur.com.pk/index.php/tanazur/index

Article:

اسلامی نظریہ روحانیت کا نفسیاتی تجزیہ

A psyclogical analysis of Islamic consept of Spirituality

Author(s) & Affiliation:

Humaira Shoukat
M. Phil Scolar, ITC, UMT, Lahore
humairashoukat0@gmail.com.

Mahak Allah
M. Phil Scolar, ITC, UMT, Lahore
jabran.saeed1122@gmail.com.

Published: July-December: 2021

Citation: Shoukat, Humaira and Mahak Allah, " A psyclogical analysis of Islamic consept of Spirituality." Tanāẓur, 2, no.2, July-December (2021): 65− 79.

Publisher Information: Institute of Religious Perspectives, Lahore Pakistan

اسلامی نظریہ روحانیت کا نفسیاتی تجزیہ

A psycological analysis of Islamic consept of Sprirituality

Abstract:

In the past century there has been a tendency to exclude spirituality and religion from psychiatry, other than as a form of pathology or pathological response. Spirituality is a common human experience. The New ways of human understanding point positively towards the new paradigm of non-material or spiritual dimension to life. Modern science has recently taken a keen interest in the wisdoms found in the ancient eastern traditions such as Buddhism, Confucianism, Taoism, and Hinduism. In the relatively new field of positive psychology, many of these eastern traditions are utilized to enhance general well-being. However, the tradition of spirituality within Islām is arguably the least examined of all the world's major spiritual philosophies in terms of its potential effects on well-being. In the modern era, the Islāmic tradition tends to be spoken of solely in terms of dogma, emphasizing its political, ritual, and legal doctrines, while neglecting its profound spiritual and moral dimensions. This article discusses the psychological anylsis of Islamic concept of spirituality.

Keywords: Islam and Spirituality, Phsycological effects of spirituality, Spirituality in modern era.

تعارف:

انسان کی تخلیق دو عناصر سے ہوتی ہے ایک مادی عنصر ہے جو حرکت میں رہتا ہے اور نشو و نما پاتا رہتا ہے دوسرا عنصر جوہر ہے جو مادہ سے الگ تھلگ ہے ان دونوں عناصر کی مختلف مرغوبات ہیں جن کو حاصل کرنے کے لئے انسان آخری حد تک جدوجہد کرتا ہے جسم کی مرغوبات کھانا، پانی ،خواہشات اور تمام لذتیں ہیں۔اور روح کی مرغوبات اور مدارج جسم کی مرغوبات سے مختلف ہیں۔انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے جسم کا تعلق مادی دنیا سے ہے اور اسکی غذا بھی مادی ہے جبکہ روح کی غذا خالق کائنات کی محبت اس کی معرفت اور قرب روح کی غذا ہے۔ جس طرح جسم کو غذا نا ملنے کی وجہ سے جسم لاغر اور کمزور ہونے لگتا ہے اسی طرح روح کو بھی روحانی غذا نا ملے تو وہ بے چین اور بر قرار ہو جاتی ہے۔دنیا میں بظاہر جسم کارفرما ہیں، ہاتھ ہلتے ہیں، پیر چلتے ہیں، منہ سے بولا جاتا ہے، آنکھیں دیکھتی ہیں، کانوں سے سنا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے. حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں روح کارفرما ہے۔کان بھی ہوں گے لیکن سنیں گے نہیں، آنکھیں ہوں گی لیکن دیکھیں گی نہیں، ہاتھ ہوں گے لیکن حرکت کریں گے نہیں، پیر ہوں گے لیکن چلیں گے نہیں،اعضائے بدن تو ہوں گے لیکن ہوں گے خاموش، کیونکہ اصل روح ہے، وہ ہو گی تو سب چیزیں حرکت میں آئیں گی، اگر نہیں ہو گی تو حرکت نہیں کریں گی۔روح اللہ تعالیٰ کے ایک فیصلے کا نام ہے، اس سے زیادہ جانا نہیں جا سکتا۔انسان کے پاس جو علم ہے وہ بہت ہی کم ہے بلکہ دیا ہی نہیں گیا جبکہ روح کو سمجھنے کے لیے زیادہ علم چاہیے جو مخلوق کی شان کے لائق نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ سے باہر کسی غیر آباد جگہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ چل رہے تھے، قریب ہی یہودی آبادی تھی، ان کے مذہبی علماء اکھٹے بیٹھے تھے، انہوں نے آپس میں کہا کہ وہ نبوت کا دعویدار آرہا ہے، ان سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں، ان میں سے جو سمجھدار تھے، انہوں نے کہا کہ مت پوچھو، ایسا نہ ہو کہ اور بے عزتی ہو جائے، لیکن اکثر نے کہا کہ نہیں پوچھنا چاہیے، پھر انہوں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ خاموش ہو گئے، علمائے یہود گھبرا گئے اور ایک دوسرے سے کہا کہ ہم کہتے تھے کہ مت پوچھو، اس کی وجہ یہ تھی کہ یونانی حکماء و فلاسفر روح میں کلام کرتے تھے جبکہ انبیاء علیہم السلام

نہیں کرتے تھے، وہ اسے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد آپ ﷺ نے فرمایا "روح امر ربی ہے"۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي "اور پیغمبر یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجیئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے"۔[1] روح وہ امر ربی ہے جس کے حکم اور پروگرام کے ماتحت ہمارا وجود شروع ہوتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ روح کا مادہ نور ہے اور یہ نور توانائی کی ایک قسم ہے، جس طرح ملائکہ نور سے پیدا ہوئے، اسی طرح روح بھی۔ سائنسی تحقیق کے مطابق روح انسان کا وہ حصہ ہے جس کا موت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مغربی ممالک میں نفوس کی جو تصاویر لی گئی ہیں، ان میں یہ ایک نوری ہیولا کی مانند نظر آتی ہے۔ انسان کا وجود مرکب ہے اور اس کے دو حصے ہیں، ایک وجود حیوانی ہے اور ایک وجود روحانی ہے۔ وجود حیوانی جسم اور جان پر مشتمل ہے جبکہ وجود روحانی ایک مستقل شخصیت ہے اور وہ روح ہے۔ جسم میں جان ایک کیفیت کا نام ہے، اور اس کا جسم سے علیحدہ کوئی تصور نہیں ہے، جبکہ روح کا ایک اپنا مستقل وجود ہے۔ روح آسمان سے ہے جبکہ جسم زمین سے ہے۔ روح کی بھی آنکھیں ہیں، کان ہیں، عقل ہے، جسم کی ان تینوں چیزیں کا تعلق دماغ سے ہے جبکہ روح کی ان تینوں چیزوں کا تعلق دل سے ہے۔ جس طرح جسم کو طاقت کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ غذا زمین سے لی جاتی ہے۔ روح کو بھی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے کلام سے ملتی ہے۔ جسم اور روح کے رجحان ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جسم جہاں سے آیا ہے اسی کی طرف جھکنا چاہتا ہے جبکہ روح اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتی ہے۔ روح ہے لیکن اس کی تفسیر قرآن مجید نے نہیں بتائی، البتہ سوچنے والوں کے لیے اشارات ہیں. سب سے پہلا اشارہ یہ ہے کہ روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے منسوب کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا "میں سڑے ہوئے گارے سے خشک ہو کر کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بشر بنانے والا ہوں، جب میں اسے تیار کر دوں اور پھر اپنی روح اس میں پھونک دوں تو اسے سجدہ کرنا" (یہاں پر علمائے کرام احتیاط کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شایان شان نہیں ہے کہ اس میں سے کوئی چیز نکلے۔ زندگی کے جس جزو کو ہم حیات کہتے ہیں، امام غزالیؒ نے اس کا نام روح حیوانی رکھا۔ جس جزو کو ہم نفس کہتے ہیں، آپؒ اس کو روح انسانی کہتے ہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ روح حیوانی کا سفلی اشیاء سے تعلق ہے، اس لیے علم طب میں اس کی وضاحت موجود ہے اور اس کے مزاج کو اعتدال پر رکھنے کے لیے علاج مقرر ہیں تاکہ بیماریوں سے نجات مل سکے۔ اس کے برعکس روح انسانی علوی ہے جو قلب کی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں نے روح کے متعلق یہ فلسفہ بیان کیا کہ یہ ایک حرارت غریزی (خون کی گردش سے گرمی پیدا ہونا) ہے، اور اس حرارت غریزی کی وجہ سے انسان زندہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک قوت نامیہ (بڑھنے والی) ہے۔ ہندو شاعر برج نارائن چکبست اس نے اس فلسفے کو یوں بیان کیا ہے کہ:۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے انھی اجزاء کا پریشاں ہونا۔

نیویارک میں ڈاکٹر ایل جان نے چند ڈاکٹروں کو اپنے ساتھ ملا کر بارہ سو لوگوں پر تجربات کیے اور یہ نتائج اخذ کیے کہ جیسے ہی انسان فوت ہوتا ہے، اس کا وزن 67 گرام کم ہو جاتا ہے، اسی قسم کے تجربات ڈاکٹر ابراہام نے لاس اینجلس میں کیے، اور یہ نتائج اخذ کیے کہ روح کا وزن 21 گرام ہے، لیکن ان تجربات کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اصل میں روح کا وزن کتنا ہے۔ سائنس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ روح کہاں چلی جاتی ہے، کائنات میں گردش کرتی ہے یا کوئی نیا بدن، کوئی نیا جسم تلاش کر لیتی ہے. سائنس اس کا ابھی تک کوئی تسلی بخش جواب تلاش نہیں کر سکی۔[2] قرآنی تعلیمات سے پتا چلتا ہے کہ روحیں اس وقت بھی موجود تھیں، جب انسانی جسم کی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو تمام انسانیت کی روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں داخل کر دی گئیں۔ یہ جنت کے زمانے کی بات ہے، چنانچہ قرآن مجید

---

[1] سورہ اسراء، آیت نمبر ۸۵

[2] Abraham Maslow,Los Angels .Penguin Books England 1970.P70.

میں ارشاد ہے کہ ''ہم نے حکم دیا کہ تم سب یہاں اتر جاؤ۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے، تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا۔ نہ ہو گا ان کے لیے کوئی خوف اور نہ کوئی غم۔''[3] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کی ہتھیلی پر چھوٹے چھوٹے ذرے رکھے گئے، وہ ان کی مٹھی میں آ گئے، ان میں کچھ کالے تھے، کچھ سفید تھے، کچھ سرخ تھے، انہیں کہا گیا کہ یہ تمہاری آل اولاد ہے۔ سید سرفراز شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو تخلیق کرنے کے بعد اُس آسمان پر اتارا جہاں فرشتے رہتے ہیں، وہاں پر انہیں فرشتوں کے نور میں غسل دیا گیا اور اس کا نام روح پاکیزہ رکھا گیا۔ وہاں سے پھر انہیں تیسرے آسمان پر اتارا گیا، اور ایک بار پھر غسل دیا گیا جس کے بعد اس کا نام روح متحرکہ رکھا گیا۔ دنیا میں روانگی کے وقت روح کو ایک ٹاسک دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ زمین پر ہے، اپنے خالق کی طرف رجوع رکھے گی۔ دنیا میں آنے اور بلوغت کی حد تک پہنچنے کے بعد روح اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع تو رکھتی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح رجوع رکھنے کا حق ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس سرسری رجوع کو بھی قبول کرتا ہے، اسے رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اگر کوئی روح ہمیشہ اپنے خالق سے رجوع رکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا علم عطا فرماتا ہے، پھر اسے دین کی سمجھ بھی آ جاتی ہے، یہی وہ مقام ہوتا ہے جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔[4] قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ''(اے نوع انسانی) اللہ تبارک و تعالیٰ کی اپنے اوپر مہربانی یاد کرو اور اس وعدہ پر غور کر جس پر تم نے پابند رہنے کا عہد کیا۔ اس وقت تم سب نے یہ کہا تھا کہ ہم نے اس وعدہ کو اچھی طرح سن لیا اور اطاعت کی۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اب تم اس وعدہ کے مطابق اپنے رب کے فرائض کو پورا کرو) بیشک اللہ تعالیٰ تمھارے دلوں کے اندرونی راز بھی خوب اچھی طرح جانتا ہے۔''[5] جب شکم مادر میں بچے کی تخلیق شروع ہوتی ہے، اور دل وجود میں آتا ہے تو اس وقت روح کو آسمان سے روانہ کر دیا جاتا ہے، اور ایک فرشتہ اس روح کو دل کے عین وسط میں رکھ دیتا ہے اور روح وہاں قید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''ماں کے پیٹ میں بچے کے آغاز کو جب 40 دن ہوتے ہیں، تو اس میں روح داخل ہوتی ہے۔'' پیدائش کے بعد حالات اعتقادات اور اعمال کے اثرات کے نتیجہ میں یہی فطری روح، نفس کی شکل اختیار کر لیتی ہے جیسے بیج سے پودا اگتا ہے۔ ہمارا مستقبل ہماری نفس کی اس حالت پر منحصر ہے جس حالت میں اس دنیا کو ہم چھوڑتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے کہ انسان جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو ایک لوتھڑے کی مانند ہوتا ہے، اچانک وہ سانس لیتا ہے اور اس میں زندگی آ جاتی ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو یادداشت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ انسان خواہ کہیں کا ہو، کسی بھی زمانہ کا ہو، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا احساس ضرور ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات ماحول کے زیر اثر وہ اس کا پورا ادراک کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے ہم کچھ لمحوں کے لیے ملتے ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پہلے ملے ہوئے ہیں، چند سیکنڈ میں ان کے ساتھ ہماری گہری وابستگی ہو جاتی ہے جبکہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ساتھ پوری زندگی گزر جاتی ہے لیکن ان کے ساتھ دوستی نہیں ہوتی اور کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بہت زبردست ہوتے ہیں لیکن ہمیں انہیں دیکھتے ہی چڑ ہو جاتی ہے اور بغیر کسی وجہ کے ان کے ساتھ نفرت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے روحوں کو گروپوں کی شکل میں پیدا کیا''، کسی گروپ میں بیس لوگ تھے، کسی میں تیس، کسی میں دو، کسی میں سو تھے، وہ گروپس صدیوں ایک ساتھ رہے ہیں، صدیوں ایک ساتھ رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کر دیا، ان میں کوئی آسٹریلیا میں پیدا ہوا، کوئی بھارت میں پیدا ہوا، کوئی پاکستان میں پیدا ہوا، پھر ہوتا یہ ہے کہ جب ان کی کہیں اچانک ملاقات ہو جاتی ہے تو کشش محسوس ہوتی ہے، اور وہ

---

3 سورۃ البقرہ:38

4 محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ ترمذی، سنن ترمذی، اسلامی کتب خانہ، ح3052

5 سورۃ المائدہ:7

کشش دوستی میں منتقل ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے روح میں غلط اور صحیح کی تمیز شروع سے رکھی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے ''قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے سنوارا،اس کو صحیح اور غلط کی تمیز عطا کی، بے شک اس نے فلاح پائی جس نے (اس کو نیک کاموں سے) سنوارا۔اور یقینا ناکام ہو گیا جس نے خراب کیا۔''[6]۔اصل میں روح اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے جس کا زندگی کے ساتھ تعلق ہے جب تک وہ عطیہ انسان کو نہیں ملتا، اس وقت نہ انسان کا شعور متحرک ہوتا ہے اور نہ جسم۔جب روح کو مطمئن نہیں کیا جاتا،اس وقت تک ہماری زندگی مکمل نہیں ہوتی،اس وقت تک ہم ایک اچھی اور خوبصورت زندگی نہیں گزار سکتے۔ہر وہ کام جو مثبت ہے،اگر اس کو کیا جائے تو روح مطمئن ہو گی اور ہر وہ کام جو منفی ہے،اس کو جب بھی کیا جائے گا،روح بے چین ہو جائے گی۔مثبت کام وہ ہوتا ہے جو دوسرے آدمی کو تکلیف نہ دے بلکہ خوشی دے جبکہ منفی کام وہ ہوتا ہے یا ہر وہ چیز جو کسی کو تکلیف دے، منفی ہوتا ہے۔روح کی زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔روح جب پہلے عالم حیات میں آتی ہے، پھر عالم برزخ میں اور پھر عالم آخرت میں جائے گی۔عالم ارواح میں روحوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیری عبادت کریں گے،اللہ تعالیٰ نے اس وعدے کے آزمانے کے لیے دنیا میں بھیجا کہ دیکھا جائے کون وعدہ پورا کرتی ہے،اور کون نہیں۔روح قبض ہونے کا عمل اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا،ہلکی سنسناہٹ ہوتی ہے،اس کا آغاز پاؤں کے انگوٹھے سے ہوتا ہے۔انسانی ذہن کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کا جسم رفتہ رفتہ فضا میں بلند ہو رہا ہے اور چاروں طرف سناٹا پھیل جاتا ہے۔روح قبض ہونے سے قبل جب نزع کا عالم ہوتا ہے،اس میں کچھ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روح جب کھینچی جاتی ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان کانٹے دار جھاڑیوں میں کھینچا چلا جاتا ہو لیکن موت کے وقت انسان کے چیخنے چلانے کی قوتیں جواب دے چکی ہوتی ہیں،اس لیے وہ فریاد نہیں کر سکتا۔حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کافر دنیا میں نیک اعمال کرتا رہا تو اس پر قبض روح کا مرحلہ آسان رہتا ہے تاکہ اس کی نیکی کا بدلہ اس کو مل جائے،اور اللہ تعالیٰ پر آخرت میں اس کا کوئی حق نہ رہ جائے۔کافر ہو، مشرک ہو، بدمذہب ہو یا گناہگار ہو،ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون ہے،ان کی روح تکلیف کے ساتھ ہی نکلے گی،لیکن نیک کے معاملے میں دو طرح کی روایات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس نیک بندے کے لیے جو درجات مقدر فرمائے ہوئے ہیں،اگر وہ اپنے ذاتی اعمال کے ذریعے ان تک پہنچ چکا ہوتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اسے موت کے وقت انتہائی آسانی عطا فرماتا ہے،اور اس کی روح ایسے نکالی جاتی ہے جیسے آٹے میں سے بال نکالا جاتا ہے،نیک آدمی کے اعمال چاہے کتنے ہی کثیر ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو اس کے لیے درجات مقدر فرمائے تھے،وہاں تک اس کی رسائی نہیں ہو پا رہی، تو پھر اس نیک آدمی کو بھی موت میں تکلیف دی جاتی ہے،اور وہ اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے،اور اس کی اس تکلیف پر صبر کرنا اور اس تکلیف میں مبتلا ہونا اس کو ان درجات تک پہنچا دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمائے ہوتے ہیں۔

مقصد انسان قرآن وسنت کی روشنی میں:

قرآنِ مجید میں اللہ ربّ العزت انسان کی تخلیق کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت و پہچان ہے۔[7] مجاہد نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا معنی ہے: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ مجھے پہچانیں علامہ ثعلبی نے کہا یہ قول اس لئے حسن ہے کیوں کہ قرآنِ مجید کی متعدد آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔[8] اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر بیان کرتے

---

6 سورۃ الشمس 7۔10

7 الاسرار المرفوعۃ رقم الحدیث 98، ص 179، دار الکتب العلمیہ، بیروت 1405ھ

8 الکشف والبیان، ج ۹، ص 120، دار احیاء التراث العربی، البیروت 422ھ

ہوئے علامہ سیّد محمود آلوسی رُوح المعانی میں ارشاد فرماتے ہیں: اس آیت میں جو فرمایا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں، اس کا معنی ہے تاکہ وہ مجھے پہچان لیں اور اللہ تعالیٰ کو پہچاننا اس کی عبادت کرنے کا سبب ہے، سو آیت میں مسبب کا ذکر ہے اور اس سے سبب کا ارادہ فرمایا ہے اور یہ مجاز مرسل ہے اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت معتبر ہے جو اس کی عبادت سے حاصل ہو نہ کہ وہ معرفت جو بغیر عبادت کے حاصل ہو۔ جیسا کہ فلاسفہ عقلی دلائل سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرتے ہیں اور یہ عمدہ قول ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ جنات اور انسانوں کو پیدا نہ کرتا تو اس کی معرفت حاصل نہ ہوتی، اس کے وجود کی معرفت حاصل ہوتی نہ اس کی توحید کی اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔[9] وہ حدیث جس کا ذکر امام آلوسی نے فرمایا ہے وہ یہ ہے: حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا تاکہ وہ مجھے پہچانے۔ اس حدیث قدسی کو کثرت سے صوفیاء نے بیان کیا ہے جس میں علامہ ابن عربیؒ، سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت سلطان باہوؒ، مجدد الف ثانی اور بہت سے صوفیاء شامل ہیں۔ لیکن کچھ محدثین نے اسے حدیث ماننے سے انکار کیا ہے۔ جیسے حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ اس حدیث قدسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں سو میں نے مخلوق کو پیدا کیا میں نے انہیں اپنی پہچان کرائی پس انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ حافظ سیوطی نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے، ''اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔''[10]

علامہ محمد بن عبدالرحمن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ لکھتے ہیں:

> ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا کلام نہیں ہے اور اس کی کوئی سند معروف نہیں ہے۔ صحیح نہ ضعیف علامہ زرکشی اور ہمارے شیخ نے بھی اسی طرح تحقیق کی ہے۔ (المقاصد الحسنۃ رقم الحدیث ۸۳۸، ص ۳۳۲) لیکن بہت سے محدثین اور مفسرین نے اس بات پر دلائل رقم فرمائے ہیں کہ اس حدیث قدسی کے معنی ٹھیک ہے اور انہوں نے اس حدیث قدسی کو قبول کیا ہے۔ جیسے ملا علی قاری علامہ سخاوی کی عبارت نقل کرتے ہوئے اس حدیث قدسی پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: لیکن اس حدیث کے معنی صحیح ہے اور یہ اس آیت سے متفاد ہے۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے۔[11]

علامہ ابن خلدون نے اس حدیث قدسی کو رقم فرمایا اور اس کے معنی کو صحیح قرار دیا۔[12] علامہ سیّد محمود آلوسی حنفی نے رُوح المعانی میں اس حدیث قدسی کو رقم فرمایا اور اس کے معنی کو صحیح قرار دیا۔[13] جب انسان اپنے قلب کو اللہ کی معرفت کے نور سے منور کرلیتا ہے اور اپنے ظاہر کو شریعت محمدی ﷺ سے آراستہ کرلیتا ہے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ انسانیت کی اصلاح کے لیے میدان عمل میں نکلے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی صحابہ کرام رضوان الاجمعین کی تربیت اسی انداز میں فرمائی۔ مکی دَور میں حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کے عقائد کو پختہ فرمایا اور اپنی نگاہِ مبارک سے ان کے باطن کا تذکیہ فرمایا جب ان کا قلب اللہ کی معرفت سے منور ہو گیا تو ہجرت مدینہ کے بعد آپ ﷺ نے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور پھر صحابہ کرامؓ کو معاشرہ میں عملی کردار ادا کرنے کا حکم دیا تاکہ اللہ کے احکام کا نفاذ معاشرہ میں ہو سکے اور معاشرہ امن کا گہوارہ بن سکے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ان احادیث مبارکہ سے ہوتا ہے۔ امام ابو عیسیٰ محمد بن

---

9 روح المعانی جز، 27، ص 33، دار الفکر بیروت، 1417ھ

10 الدرر المنتشرہ رقم الحدیث 355، ص 227، دار الفکر، بیروت، 1415ھ

11 الاسرار المرفوعۃ رقم الحدیث، 498، ص 179، دار الکتب العلمیہ، بیروت 1405ھ

12 علامہ عبدالرحمن بن محمد ابن خلدونؒ المتوفی 808ھ ''تاریخ ابن خلدون جلد ا، المقدمہ: فی علم التصوف، ص 385، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان

13 علامہ ابی الفضل شہاب الدین سید محمود الالوسی البغدادی المتوفی 127ھ تفسیر رُوح المعانی، جلد 14، ص 39، المکتبہ الحقانیہ، ملتان پاکستان

عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جب بنو اسرائیل میں گناہ بہت بڑھ گئے تو ان کے علماء نے منع کیا، کیا وہ باز نہیں آئے۔ وہ علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے تو اللہ نے ان کے دل بھی ان کی طرح کر دیے اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی گئی کیوں کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے پھر آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے۔ تم ان کو ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکے رہنا اور تم ظالموں کے ہاتھ کو پکڑ لینا اور ان کو حق کے مطابق عمل پر مجبور کرنا۔[14] امام ابو داؤد سلیمان بن اشعب متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں: قیس بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: اے لوگو! تم یہ آیت تلاوت کرتے ہو اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کسی گمراہی سے تمہیں کوئی ضرر نہیں ہوگا۔[15] اور تم اس آیت سے غلط مطلب نکالتے ہو اور ہم نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا، جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھوں کو نہ پکڑیں تو اللہ ان سب پر عذاب لے آئے گا اور ہیثم کی روایت میں ہے، جس کسی قوم میں گناہوں پر عمل کیا جاتا ہے اور وہ ان گناہوں کو مٹانے پر قادر ہو پھر نہ مٹائیں تو عنقریب اللہ ان سب پر عذاب لے آئے گا۔[16] بحیثیت فرد جہاں انسان کی اپنی اصلاح ضروری ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کا تابع ہونا ضروری ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں اسلامی نظام کو نافذ کرنے کے لیے عملی اقدام اُٹھائے تاکہ معاشرے میں عدل وانصاف قائم ہو سکے۔

اسلام اور روحانیت:

اللہ کی رضا کا حصول روحانیت کا سب سے بلند مرتبہ ہے۔ اس مرتبے کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مضبوط قلبی تعلق مطلوب ہے اور یہی عبادت کی روح ہے۔ جبریل امینؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے، آنجنابؐ نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: **اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ**[17] اللہ کی عبادت اس طرح کیجیے کہ گویا آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو اتنی کیفیت پیدا کیجیے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رُوبرو ہونا بندگی کا کمال ہے، مگر اس کیفیت کا دل میں پیدا ہونا پاکیزگیِ قلب اور انابت کی گہرائی چاہتا ہے۔ خدا کو دیکھنے کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اعضا و جوارح کی تربیت کے ساتھ نفس کا تزکیہ اور دل کی خشیت ضروری ہے۔ اس سے نیچے کی منزل یہ ہے کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ خدا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تصور بھی انسان کے دل کو بدل دیتا ہے اور نفس کے شرور و فتن کو زائل کر دیتا ہے۔ یہی اخلاص ہے۔ ایک مزدور کو اگر یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک موقعے پر موجود نہیں ہے تو وہ کام میں سستی کرتا ہے، وقت ضائع کرتا ہے اور کام کرتا بھی ہے تو بے دلی سے کرتا ہے، کام کا مطلوبہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ لیکن اگر کسی مزدور کو یہ معلوم ہو کہ اس کا مالک اس کے سامنے کھڑا ہے تو کام میں چستی دکھاتا ہے، جی لگا کر کام کرتا ہے اور وقت گذاری سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی طرح بندے کو یہ احساس ہو جائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس کے دل کی کیفیت اور جسمانی عمل کی حالت بدل جاتی ہے۔ اس کی عبادت میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی سے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ عبادت سے مراد صرف نماز نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عبادت ہے اور ہر عبادت اپنی قبولیت کے لیے اخلاص چاہتی ہے۔ اللہ کی رضا جوئی، بے

---

14 سنن ابو داؤد، ج۳، رقم الحدیث 4239

15 المائدۃ 105

16 سنن ترمذی، ج۵، رقم الحدیث 3098

17 الجامع الصحیح مسلم

لوث بندگی، اللہ سے خوف وامید کے ساتھ طلب، قبولیت کے دروازے کھولتی ہے۔ کسی عمل میں نام ونمود اور ریاکاری شامل ہو جاتی ہے تو اللہ اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے اور وہ عمل مقبول نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ کا حکم ہے: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ [18] اللہ کی عبادت کرو اس کے لیے دین کو خالص کر کے، آگاہ رہو کہ دین خالص اللہ کے لیے ہے۔ اسی طرح صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، غربا پروری اور ناداروں کی حاجت روائی سب انسانیت کی بھلائی اور روحانیت کی ترقی کا عمل ہے، مگر اس کی شرط بھی اللہ کی رضا جوئی ہے۔ ارشاد ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا ۹ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۱۰ [19] (اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔

اللہ کا ذکر دل کی زندگی ہے:

اخلاص کے لیے اللہ کے حاضر وناظر ہونے کا احساس ضروری ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کا استحضار اور اس کا ذکر کرتے رہنا روحانیت کی شاہِ کلید ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۱۵ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۱۷ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۱۸ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۱۹ [20] بے شک وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا، اپنے رب کے اسم گرامی کا ذکر کیا اور نماز ادا کی، بلکہ تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، جب کہ آخرت باقی رہنے والی اور بہتر ہے۔ یہ بات گذشتہ آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے، صحیفہ ابراہیمؑ اور صحیفہ موسیٰؑ میں۔ اللہ کے ذکر سے روحانیت جِلا پاتی ہے اور روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ یہ بات پہلے بھی تمام آسمانی صحیفوں میں بیان کی گئی ہے اور اس قرآن میں بھی اس کی تائید کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۴۱ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا [21] ۴۲ اے ایمان والو! اللہ کا کثرت سے ذکر کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔ دل میں اللہ کی یاد اور زبان سے اس کا ذکر قلب انسانی کو تروتازہ رکھتا ہے۔ ذکر الٰہی روح کی غذا ہے۔ جس دل میں خدا کی یاد ہو وہ زندہ ہے اور جو دل یادِ خدا سے غافل ہو وہ مردہ ہے۔ قرآن نے یہ راز اس طرح عیاں کیا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۲۸ [22] جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے طمانیت پاتے ہیں۔ آگاہ ہو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو تسکین ملتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روحانی نکتے کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے: مَثَلُ الَّذِيْ يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِيْ لَا يَذْكُرُهٗ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ [23] اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد کرتا ہے زندہ کی ہے، اور اس شخص کی مثال جو خدا کو یاد نہیں کرتا مردہ کی ہے۔

---

18 الزمر ۳۹:۲-۳

19 الدھر ۷۶:۸-۱۰

20 الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۹

21 الاحزاب ۳۳:۴۱-۴۲

22 الرعد ۱۳:۲۸

23 الجامع الصحیح بخاری

قرآن کی نظر میں ہر سانس لینے والا انسان زندہ نہیں ہے بلکہ ذکر کرنے والا انسان زندہ ہے۔ جسمانی زندگی کھانے سے اور سانس لینے سے قائم رہ سکتی ہے مگر روحانی زندگی یادِ خدا کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اسلام کے احکام تو بہت سے ہیں مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجیے جسے میں لازم پکڑ لوں۔ رسولؐ پاک نے ارشاد فرمایا: **لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللهِ** [24] تمھاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رہے۔ اللہ کے ذکر کی ایک تو عمومی شکل ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، صبح و شام اللہ کے نام کا ورد کیجیے، اس کی تسبیح کیجیے، جس کا حکم قرآن پاک میں اس طرح دیا گیا ہے: **وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ** [25] اپنے جی میں اپنے رب کا ذکر کرو، عاجزی اور خاموشی اور کم آواز سے صبح و شام اور غافلوں میں نہ ہو جاؤ۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: **فَسُبْحٰنَ اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ** [26] اللہ سزاوارِ تسبیح ہے، جب تمھاری شام ہو اور جب تمھاری صبح ہو، اسی کے لیے آسمان و زمین میں حمد ہے، رات میں بھی اور جب تمھارا دن ہو۔ اللہ کا ذکر انسان کے میل کچیل کو دھو دیتا ہے، دل کی سختی کو دور کر کے خشیت و انابت پیدا کر دیتا ہے، اور اسے بارگاہِ رب العزت میں نذر کے قابل بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ** [27] سچے اہل دل تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی ذکر کے لیے بہت سے وظائف کی تعلیم فرمائی ہے۔ اس میں سب سے آسان اور مقبول ذکر ہے:- **سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ**- رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ ،حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ** دو جملے رحمن کو بہت بہت پسند ہیں، وہ جملے زبان پر ہلکے اور میزان میں بھاری اور رحمن کو محبوب ہیں۔ **سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ** ۔[28] اللہ کے ذکر کی دوسری شکل خاص اور ضابطہ بند ہے اور وہ نماز ہے جو پانچ وقتوں میں فرض ہے اور بقیہ اوقات میں نفل ہے۔ نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ** نماز قائم کر میری یاد کے لیے۔[29] ذکر کی منظم اور مکمل صورت نماز ہے۔ اسی لیے نماز کو مومن کی معراج فرمایا گیا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهٗ** ،"جب تم میں سے کوئی نماز ادا کر رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے"۔ بندہ کا خدا سے، حبیب سے مکالمہ وجد انگیز، روح پرور اور حاصل زندگی ہوتا ہے۔ یہ مقام انسان کو نماز سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ** () نماز قائم کرو دن کے کناروں میں اور رات کے حصے میں، بے شک

---

24 سنن ترمذی

25 الاعراف ۷:۲۰۵

26 الروم ۱۸-۱۷:۳۰

27 الانفال ۸:۲

28 الجامع الصحیح بخاری

29 طٰہٰ ۱۴:۲۰

نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے ذکر کرنے والوں کے لیے۔[30] عمومی ذکر کا اعتبار اسی وقت ہوتا ہے جب انسان ذکر خصوصی، یعنی نماز کا اہتمام کرتا ہو۔ جو شخص فرض نمازوں کا پابند نہیں وہ لاکھ ذکر الٰہی کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ معتبر نہیں، کیوں کہ ایمان اور کفر کے درمیان حدِ فاصل نماز ہے۔ جو شخص خدا کا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس کے آگے سر جھکانے سے اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے کیسے روگردانی کر سکتا ہے۔ نماز کے علاوہ دوسری تمام عبادات کا اہتمام کرنا، جیسے صدقہ، زکوٰۃ، خیرات، روزہ، حج، جہاد اور ان عبادات کے علاوہ تمام اعمالِ صالحہ کا التزام کرنا روحانیت کے لیے لازم ہے۔ صرف کلمۂ توحید کا اقرار کرنا اور شرک و کفر سے پرہیز کرنا روحانی زندگی کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ نیک عمل کو زندگی کا طریقہ اور وظیفہ بنالینا ضروری ہے۔ روحانیت کے لیے اعمال صالحہ کا اہتمام کرنے کی ضرورت اور حکمت کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

> ”عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے، صرف ایمان پر نجات کا دارومدار ہے، اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسانیت کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے۔ ہر قسم کی کامیابیوں کا انحصار انھی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف اصول طبّی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔[31]

عمل صالح کا اہتمام کرنے سے انسان اللہ کی نظر میں بھی محبوب ہو جاتا ہے اور دوسرے انسان بھی اس سے محبت اور اس کی عزت کرنے لگتے ہیں، یعنی جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوتا ہے وہ بندوں کی نظر میں بھی محبوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: **اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا** جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کا اہتمام کیا عنقریب رحمٰن ان کو دوست بنائے گا۔[32] اعمالِ صالحہ کا فائدہ انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ بُرے اعمال، بُرے خیالات اور بُری باتوں سے اجتناب کرے۔ اعمالِ صالحہ روحانی امراض کے لیے دوا ہیں اور بری باتوں سے دُور رہنا پرہیز کے درجے میں ہے۔ جب تک مریض پرہیز نہیں کرتا دوا کارگر نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ** ظاہری اور باطنی ہر قسم کی برائی ترک کر دو[33] بُرے اعمال اور بُرے خیالات کا اثر انسان کے قلب و ذہن پر پڑتا ہے اور اسے روحانی کیفیات کا حامل بننے سے روکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: **كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ** ہرگز نہیں، بلکہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔[34] نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نکتہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو وہ سیاہی زائل ہو جاتی ہے، اور اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے تو سیاہی

---

30 ھود ۱۱۴:۱۱

31 سیّد سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ، ج۵، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص۱۱

32 مریم ۹۶:۱۹

33 الانعام ۱۲۰:۶

34 المطففین ۱۴:۸۳

زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے۔اس لیے روحانیت کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اوصاف رزیلہ انسان کے دل سے نکل جائیں اور دوسری منزل یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا دل خو گر ہو جائے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ واستغفار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اے مومنو! تم سب اللہ سے توبہ کرو تا کہ فلاح پائو۔[35] انسان سے دانستہ خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔توبہ ان خطاؤں سے معافی کا دروازہ کھولتی ہے اور اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتی ہے۔اللہ کو وہ بندہ پسند ہے جو غلطی کرے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرے۔اللہ تعالیٰ کے حضور حضرت آدمؑ اور ابلیس دونوں سے غلطی سرزد ہوئی۔حضرت آدمؑ کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے منع کرنے کے باوجود انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا اور ابلیس کی غلطی یہ تھی کہ اللہ کے حکم دینے کے باوجود حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کیا۔دونوں خطاکار تھے مگر ایک راندۂ دربار ہوا اور دوسرے نے معافی اور محبت پائی،اس لیے کہ دونوں کے رویے میں بڑا فرق تھا۔

پہلا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے اپنی غلطی کا اقرار کیا مگر ابلیس نے اپنی غلطی کا اقرار نہیں کیا۔دوسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور ابلیس کو اپنی غلطی پر ندامت نہیں ہوئی۔تیسرا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے اپنی غلطی کو اپنے نفس کی خطا قرار دیا اور ابلیس نے اپنی غلطی کو خدا سے منسوب کیا اور کہا: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ "اے رب تو نے مجھے گمراہ کیا"[36]۔چوتھا فرق یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے گڑگڑا کر توبہ کی اور کہا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جان پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں معاف نہ کرے اور رحم نہ کرے تو ہم خسارے میں مبتلا ہو جائیں گے۔اور ابلیس توبہ کرنے کے بجائے گناہ پہ قائم رہا۔ابلیس کا یہ رویہ غلطی پر اصرار اور سرکشی کا تھا۔حضرت آدمؑ کا رویہ عاجزی کا تھا۔ابلیس نے استکبار کیا،حضرت آدمؑ نے استغفار کیا۔اسی فرق نے دونوں کے انجام کو جدا کیا۔ ابلیس ملعون ہوا اور حضرت آدمؑ محبوب ہوئے۔

روحانیت کے انسانی زندگی پر اثرات:

نفس ایک جسم لطیف ہے جو جسم کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے اور یہ مادی عناصر اربعہ سے بنا ہے اور فلاسفہ اور اطبا اسی کو روح کہتے ہیں روح ایک جوہر مجرد ہے جو اس طبعی روح یعنی نفس کے ساتھ ایک تعلق رکھتا ہے جسم کی زندگی نفس سے اور نفس کی زندگی انسانی روح سے وابستہ ہے اور اسکی حقیقت کا علم پیدا کرنے والے کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے انسان کا نفس اگر وحی کی تعلیم کے مطابق ریاضت و محنت کر لیتا ہے تو وہ ممتاز ہو جاتا ہے ورنہ جسم کثیف کے خراب اثرات میں ملوث ہو جاتا ہے۔تزکیہ نفس سے مراد دل کی پاکیزگی،روح کی صفائی ہے نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر نیکی اور خشیت الٰہی کے راستے پر ڈال دینا در حقیقت روحانیت کی اصل تصویر ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے اپنی آئندہ نسل کی دنیوی اخروی فلاح و بہبود کے لئے یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے پروردگار! میری اولاد میں سے ایک رسول بھیجئے جو انکو آپکی آیتیں پڑھ کے سنائے۔قرآن و سنت کی تعلیم دے اور انکو ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک رکھے۔[37] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں سے تیسرا فرض تزکیہ نفس

---

35 النور ۳۱:۲۴

36 الحجر ۳۹:۱۵

37 مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، 1988، 33/1

ہے کہ اپنے روحانی تصرف سے دلوں کے آئینے کو جلادے اور روشن کرے تاکہ حقائق و معارف ان میں جلوہ نما ہو سکیں۔[38] تزکیہ نفس سے مراد سنوارنا ہے۔اس میں خیالات، عادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، سیاست غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔[39]

تزکیہ نفس کا مقصد:

تزکیہ نفس کا مقصد بنی نوع انسان کو تمام ظاہری و باطنی نجاستوں سے پاک کرنا ہے۔ظاہری نجاستوں سے تو عام مسلمان واقف ہے باطنی نجاستیں کفر و شرک، غیر اللہ پر کامل اعتماد، فاسد اعتقاد، تکبر، حسد، بغض، کینہ، حرص طمع ریاکاری، اس میں شامل ہے۔اسی لئے تزکیہ نفس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جداگانہ فرائض کہا گیا ہے۔

روحانی تربیت کی ضرورت:

انسان کی اصلاح کے لئے صرف تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی تربیت بھی ضروری ہے تعلیم کا مقصد در حقیقت صحیح راستہ دکھلا دینا ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا کافی نہیں ہوتا جب تک ہمت کر کے قدم نا اٹھائے اور راستے پر نا چلے اور ہمت کا یہ نسخہ اہل اللہ کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ورنہ سب کچھ جاننے کے بعد حالت کچھ یوں ہوتی ہے:

جانتا ہون ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

نامور عربی ادیب ابن المقفع کا قول ہے کہ جو شخص امام بننا چاہتا ہے اسے پہلے اپنے نفس کی تربیت کرنی چاہیئے۔[40]

تعلیم اور تہذیب تو ہر قوم میں کسی نا کسی صورت میں کامل یا ناقص طریقے پر ضروری سمجھی جاتی ہے ہر مذہب و ملت میں اسکو انسانیت کا حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو صحیح اور جامع تعلیمی پروگرام پر مشتمل ہے جو انسان کی انفرادی، اجتماعی زندگی کی ضمانت دیتا ہے اور اس میں تزکیہ اخلاق اور روحانی تربیت بھی شامل ہے جسے عام معاشروں نے سرے سے ہی نظر انداز کر رکھا ہے ان کے ہاں انسان کی صکاحیت کا معیار صرف دینی تعلیم کو ہی سمجھا جاتا ہے لیکن اسلام نے اس کے ساتھ روحانیت کی تربیت کو بھی شامل کر کے تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر کے دکھایا ہے جو خوش نصیب حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے تعلیم کے ساتھ انکا باطنی تزکیہ بھی ہوتا رہا۔ان کی عقل و دانش اور حکمت کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہو گئے اور دوسری طرف انکی روحانیت کا یہ عالم تھا جسکی قرآن نے خود گواہی دی: **والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم**[41]۔ اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔تم انہیں رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے وہ اللہ کا فضل اور اسکی رضامندی تلاش کرتے ہیں۔یہی وجہ تھی جس طرف وہ چلتے تھے فتح و نصرت انکے قدم چومتی تھی ان کے عظیم الشان حیران کر دینے والے کارنامے آج بھی دنیا کو مرعوب کرتے ہیں وہ اسی روحانیت کے اعلیٰ درجات ہیں دور حاضر میں تعلیم کی بہتری کے لئے نصاب کی ردوبدل پر زور دیتے ہیں لیکن روح کی تعلیم کو درست کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصاب کی تدوین اور ترمیم سے زیادہ روحانیت پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔قرآن کریم میں نفس کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں: قرآنی آیات کی

---

38 پیر محمد کرم شاہ، ضیاالقرآن، ضیاالقرآن پبلی کیشنز لاہور، 1402ھ، 1/94-95

39 مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، 8/665

40 ابن المقفع، الادب الصغیر از رسائل البلغا، مرتبہ محمد علی کرد، مطب الجنۃ التالیف الترجمہ القاہرہ، طبع چہارم، 1954، ص14

41 سورہ الفتح-29

روشنی میں انسانی نفس کی تین حالتیں ہیں۔ نفس امارہ بالسوء۔ **انانفس لامارۃبالسوء**[42] برے کاموں کا حکم کرنے والا۔2: نفس لوامہ **:ولااقسم بالنفس اللوامہ** [43]برے کاموں پر ملامت کرنے والا۔3: نفس مطمئنہ **:یاایتھا النفس المطمئنہ** [44]-اللہ کے ذکر اور اسکی اطاعت سے سکون پانے والا۔

نفس امارہ: پہلی حالت انسانی نفس کی امارہ بالسوء یعنی برے کاموں کا حکم کرنے والا ہے جیسا ایک حدیث شریف میں آیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے ساتھی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا یہ حال ہو کہ اگر تم اسکا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا کردے اور اگر تم اسکی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو، تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ صلی علیہ وسلم اس سے زیادہ دنیا میں کوئی برا انسان ہو نہیں سکتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔[45] سب سے بڑا دشمن خود انسان کا نفس ہے جو برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار کر دیتا ہے۔

نفس لوامہ: نفس کا معنی جان یا روح ہے اور لوامہ لوم سے ماخوذ ہے جس کے معنی ملامت اور سرزنش کرنے کے ہے نفس لوامہ سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے یعنی جو گناہ سرزد ہو یا کسی فرض یا واجب کی ادائیگی میں کوتاہی ہو۔ اچھے اور نیک اعمال میں بھی خود کو ملامت کرتے رہنا کہ مین اس سے زیادہ اچھے اعمال کیوں نہیں کر سکا۔ در حقیقت مومن اپنے ہر نیک اور برے اعمال میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا رہتا ہے۔[46] اسی مفہوم کی بناپر حضرت حسن بصری نے نفس لوامہ کی تفسیر نفس مومنہ سے کی ہے فرمایا کہ اللہ کی قسم مومن تو ہمیشہ ہر حال میں اپنے نفس کو ملامت ہی کرتا رہتا ہے کیونکہ عبادات کے حق کو پورا کرنا تو کسی کے بس میں نہیں ہے اس لئے اس کے حق کی ادائیگی میں تقصیر و کوتاہی اس کے سامنے ہی رہتی ہے۔[47]

نفس مطمئنہ: قرآن کریم میں مومن کی روح کو نفس مطمئنہ سے خطاب کیا گیا ہے، فرمایا: **یاایتھاالنفس المطمئنہ** مطمئنہ کا لفظی معنی ساکنہ ہے مراد وہ نفس ہے جو اللہ کے ذکر اور اطاعت سے سکون وقرار پاتا ہے اور اس کے ترک کرنے سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور یہ وہی نفس ہو سکتا ہے جو ریاضت و مجاہدہ کر کے اپنی بری عادات اور اخلاق رذیلہ کو دور کر چکا ہو۔ نفس مطمئنہ کی تفسیر کے بارے کئی اقوال منقول ہیں۔ نفس مطمئنہ وہ ہے جس نے اس بات کا یقین کر لیا کہ اللہ اس کا رب ہے۔[48] **الذین امنووتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب**[49] جس طرح مچھلی کو پانی میں سکون وراحت محسوس کرتی ہے اس طرح جس شخص کو اللہ کی یاد میں سکون واطمینان محسوس ہو

---

42 سورہ یوسف، 53

43 سورہ القیامہ، 2

44 سورہ الفجر، 27

45 مفتی محمد شفیع، معارف القرآن 74/5

46 پانی پتی، علامہ قاضی ثناءاللہ، تفسیر مظہری، ترجمہ از مولانا عبداللہ، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، 1985، 12/206

47 ایضا

48 البغوی، امام ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء، معالم التنزیل ادارہ تالیف اشرفیہ ملتان 486/4

49 سورہ الرعد، 28

اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔اس اطمینان کااس وقت تصور نہیں نہین کیا جاسکتا جب تک انسان کے صفات رذیلہ دور ناہو یہ اس وقت تک دور نہیں ہوتاجب تک اللہ کی تجلیات سے بہرور ناہو،اسی وقت انسان کو حقیقی ایمان نصیب ہوتاہے۔[50]علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ گھبراہٹ اوراضطراب کے بعد جو سکون ملتاہے اسے اطمینان کہتے ہیں اور روح، نفس کو سکون تب میسر ہوتاہے جب وہ یقین، معرفت، اور شہود کی اعلیٰ منزل پر فائز ہوجائے اور یہ مقام ذکرالٰہی کی کثرت ودوام سے حاصل ہوتاہے اللہ کافرمان ہے:**الابذکر اللہ وتطمئن القلوب**- جب انسان اس مقام پر فائز ہوتاہے تواسکو تمکین سے نوازاجاتاہے اس کے بعد اسکو رد ہونے کا کوئی خطرہ نہین ہوتا۔[51]ایسے نفس مطمئنہ کواپنے خطاب دلنواز سے یوں مشرف کیاجائے گا: **ارجعی الی ربک**- واپس آجااپنے پروردگار کے پاس۔یعنی وہ مخصوص مقام جہاں وہ اپنے بندوں کواپنی خصوصی عنایات سے سرفراز کرتاہے تواسکی محبت میں آنسو بہاتارہاتواس کت عشق مین جلتارہااوراس کے سوز فراق میں تڑپتارہا۔لے اب فراق کی طویل رات سحر آشنا ہورہی ہے[52]۔قرآن کریم میں انسانی نفس کوایک جگہ امارہ بالسوہ،دوسری جگہ لوامہ،اور تیسری جگہ مطمئنہ کہاگیاہے.

نفس امارہ،لوامہ،اور مطمئنہ میں مطابقت:

صوفیاکرام نے نفس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ نفس اپنی جبلت وفطرت کے اعتبار سے امرہ بالسوء ہوتاہے یعنی انسان کو برے کاموں میں مبتلا کرنے کاداعی ہوتاہے مگر عمل صالح سے یہ نفس امارہ بن جاتاہے کہ اپنی برائی پر نادم ہونے لگتاہے اس سے اگلی منزل عمل صالح اور قرب الٰہی کے حصول کی کوشش اور خلاف شرع کام سے طبعی نفرت بھی ہونے لگے یہ نفس مطمئنہ ہوجاتاہے۔[53]اسی نفس مطمئنہ نے تزکیہ کوایک مستمر جدوجہد اور مسلسل تگ ودو کا عمل بنادیتاہے اس میں کوئی وقفہ اور ٹھہراؤ نہیں ہوتااس سفر میں کوئی موڑ یامقام ایسانہیں آتاجہان پہنچ کرانسان یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل ہے بلکہ یہ ایک خوب سے خوب ترکی جستجوہے۔جس رفتار سے اعمال اخلاق اور ظاہر وباطن میں جلاپیداہوجاتاہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب ترکہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں

تزکئے کے اس فطری عمل سے نہایت مشکل بنادیتاہے اگر شخص اس کی وسعتوں کو دیکھ کر بالفرض نہ بھی گھبرائے تو بھی ڈر رہتاہے کہ کہیں اسکی ہمت ختم ناہوجائے لیکن اگر یہ عمل فطری طریقے پراس تدریج وترتیب کے ساتھ کیاجاتاہے جواس کے لئے حضرت محمدؐ کی تعلیمات میں بتائی گئی ہیں تواس وسعت کے باوجود ایک طالب حق کے لئے اس سے زیادہ پرکشش اور کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔اس کی وسعتوں سے دل پر ہراس توطاری ہوتا ہے۔لیکن اس راہ پر غیب سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے وہ رہنمائی اس قدر تسلی بخش ہوتی ہے کہ ہمت برابر بندھی رہتی ہے اور دل کبھی حوصلہ نہیں ہارتا۔[54]ارشاد باری تعالیٰ؛**والذین جاہدوافینالنھدینھم سبلنا**[55]۔ جو ہماری میں طلب میں جدوجہد کرتے ہے ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں

تزکیہ نفس انسان کی فلاحو بہبود کا باعث ہے:

---

50 تفسیر مظہری 404/12

51 البروسی، علامہ اسماعیل حقی، تفسیر روح البیان، داراحیاالتراث العربی بیروت، 10، 431/1985،

52 عثمانی۔علامہ شبیر، تفسیر عثمانی، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ، ص 791

53 عثمانی، علامہ شبیر احمد، تفسیر عثمانی، شاہ فہد قرآن کریم پرینٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ، ص، 321

54 اصلاحی، مولانا امین احسن، تزکیہ نفس، ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد، 1981، ص 37، 38

55 سورہ العنکبوت، 19

اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں فسق و فجور تقویٰ نیکی کا الہام کر دیا ہے پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گناہ اختیار کر لے یا اطاعت و نیکی کی جب وہ اپنے اختیار سے ان مین سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی اختیار پر اس کو عذاب یا ثواب ملتا ہے اللہ نے فرمایا ہے کہ :

قدافلح من زکھا۔وقد خاب من دسھا۔[56] جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوا۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ جب یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتے تو باآواز بلند یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔**اللھم انت نفسی تقواھا انت الیھا ومولھا وانت خیر من زکھا**[57]۔ یااللہ میرے نفس کو تقویٰ کی توفیق عطا فرما آپ ہی میرے نفس کے ولی اور مربی ہیں۔

حاصل کلام:

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کی فلاح و بہبود کا دار و مدار تزکیہ نفس پر ہے ہمارے نبی ﷺ نے اس کی تعلیم دی جس نے اپنے نفس اور روح کا تزکیہ و تصفیہ کر لیا وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو گیا۔ انسان نفس کی بیماریوں کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہوتا ہے خاص کر ٹینشن، ڈپریشن، جو آجکل عام ہو گئی ہے انسان کو چاہیئے کہ نفس کی بیماریوں کی تشخیص کر لے اور اہل اللہ کی صحبت میں رہے۔

کتابیات:

* ابن المقفع، الادب الصغیر از رسائل البلغا، مرتبہ محمد علی کرد، مطب الجنۃ التالیف الترجمہ القاہرہ، طبع چہارم، 1954
* الاسرار المرفوعۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت 1405ھ
* اصلاحی، مولانا امین احسن، تزکیہ نفس، ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد، 1981
* آلوسی، علامہ ابی الفضل شہاب الدین سید محمود الالوسی البغدادی المتوفی 127ھ، روح المعانی، دار الفکر بیروت، 1417ھ
* انکشف والبیان، دار احیاء التراث العربی، البیروت 422ھ
* البروسی، علامہ اسماعیل حقی، تفسیر روح البیان، دار احیا التراث العربی بیروت، 1985
* البغوی، امام ابو محمد الحسین بن مسعود الفرا، معالم التنزیل ادارہ تالیف اشرفیہ ملتان۔ س ن
* پانی پتی، علامہ قاضی ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ترجمہ از مولانا عبداللہ، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، 1985
* پیر محمد کرم شاہ، ضیاالقرآن، ضیاالقرآن پبلی کیشنز لاہور، 1402ھ
* الدر المنتشرہ، دار الفکر، بیروت، 1415ھ
* سیّد سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ، ج۵، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
* عثمانی۔ علامہ شبیر، تفسیر عثمانی، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس مدینہ منورہ،
* محمد بن عیسیٰ ابو عیسیٰ ترمذی، سنن ترمذی، اسلامی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۹۲ء
* مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، 1988
* Abraham Maslow,Los Angels. Penguin Books England 1970.P70.

---

56 سورہ الشمس 9،10

57 صحیح مسلم، کتاب الذکر 73، دار احیاء الکتب العربیہ بیروت